کیا وجہ ہے کہ دلیل اور کلام سے کفار مسلمان نہیں ہوتے

کیا علم کلام کے زور سے کبھی کوئی مسلمان ہوا

مسلمانوں کو شکوک وشبہات اور الحاد و بے دینی سے بچانے کے لیے جو تدبیر ہمارے حکمائے متکلمین نے اختیار کی وہ بھی گو اپنی جگہ پر ایک چیز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علومِ زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین واذعان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہوسکتا ہے کہ بیماری کے کچھ عوارض زائل ہوجائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور جس زمانہ میں ہوا روم ومصر وشام وایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الٰہیات کے یہ شکوک وشبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوتِ ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک وشبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، **تعلیم یافتگانِ نبوت جہاں پہنچے، سیدھی، سادی اور بے کج و پیچ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی اور اُسوئہ رسول جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ھاتھ میں تھے، جن کو لے کر وہ آگے بڑھتے گئے، اور تاریکی کا پردہ چاک ھوتا گیا، صحابہ کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا**، ان کے زمانہ میں ہذیل، اعلاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین واخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی۔ یہی صورت حال اس دور کے بعد بھی رہی۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اور حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابوسعید کا حکیم مشرق بوعلی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے ''انچہ تو می گوئی من می دانم وانچہ تو می دانی من می بینم'' دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے **صرف ھندوستان کو دیکھیے، یہاں خیالی اور شرح مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا اور چشت و سہرورد کے خانوادوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا. بات یہ ھے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ھے لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں.**

اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بیکار و ہیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ ملّتِ اسلامیہ ایک عالمگیر سلطنت ہے اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امراء اور وزراء تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف

عہدوں اور درجوں کے کام کے لائق بنائے گئے ہیں۔ وزراء ہیں جو سلطنت اور فرمانروائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امراء ہیں جو رموز سلطنت کے مشیر اور کارپرداز ہیں۔ سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خدمت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت و بقاء اور ترقی کے لیے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزراء اور امرا یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام حفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لیے وہی سب کچھ ہیں وزراء اور امراء کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیر خواہ نہیں کہ وہ نہیں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی سلطنت کے مصالح وحکم کے واقف کار اور سلطنت کی حکمت عملی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع وضرر کے نگراں وزراء اور امراء ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض اور اسی کے مصالح وحکم کی رعایت ان پر واجب ہے جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں [امام غزالیؒ نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہے اور ان کو **حارس دین عن تخیلات المتبدعہ** کا خطاب دیا ہے اور حج کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہہ دی ہے۔ باب العلم الذی ہو فرض کفایہ] کی ہے جو دین کو معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے علم وفن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں اور حضرات محدثین وفقہا وصوفیۂ صافی کی مثال سلطنت کے وزراء اور امراء کی ہے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی حکمت عملی، سلطنت کے مصالح وحکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام کی طاقت ہوتی ہے۔ فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے مفوضہ حصۂ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے مگر سلطنت کی پالیسی اور رموزِ مملکت اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر متکلمین یہ کہیں کہ ملت کے کلی مصالح وحکم کے وہ نگراں ہیں تو وہ غلطی کریں گے اور اگر اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء یہ سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بیکار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے اس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنی مفروضات تھے جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو خاموش کرنے کے لیے انھوں نے کھڑے کر لیے تھے، اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء کو چاہیے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر اس وقت تک ان کو ملت کا باغی وطاغی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگیں کہ ان مدافعی مناظروں میں ان کی زبان وقلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عین اسلام ہے، اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ سرحدی حفاظت کے بجائے جو ان کا فریضہ ہے مرکزی سلطنت کے اساس وانتظامِ مملکت کے رموز واسرار وقواعد واحکام میں مداخلت ہے جس کا دوسرا نام طوائف الملو کی یا بغاوت ہے، اسی لیے یہ بات بطور اصول کے مان لی گئی ہے کہ ''لازم مذہب مذہب نہیں''۔ یعنی متکلمین کے آراء ونظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا۔

گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمین حق اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ اخیر عمر میں جب جنگجویانہ قویٰ میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعوؤں کی حقیقت سے ان کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہینِ عقلی کے بجائے وحی الٰہی اور تعلیم نبویﷺ کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں **اِنی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین.** امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابوالحسن اشعریؒ نے چالیس برس کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر قبول حق کا اعلان کیا۔ کہتے ہیں کہ جب امام غزالیؒ کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے

سینہ پر دھری تھی، اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم ان کی اخیر زندگی کا مشغلۂ حیات تھی۔ علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیم اور ملا علی قاریؒ [حوالہ کے لئے دیکھیے شرح فقہ اکبر ملا علی قاریؒ ہند ص ۶، عقیدۂ حمویہ کبریٰ، رسائل ابن تیمیہ مصر ص ۴۱۷، اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند وصواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص ۹] نے متعدد حکما اور متکلموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہیوں کے اعتراف اور وحی نبویؐ کے عقیدہ کے اقرار پر ہوا، مرتے وقت امام جوینیؒ کی زبان پر یہ تھا ''میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگا تا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں''۔ یا یہ کہا کہ ''اب میں نیشا پور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں''۔ اسی قسم کے اقوال علامہ آمدیؒ شہرستانیؒ اور خسروشاہیؒ وغیرہ متکلمین سے منقول ہیں۔

امام غزالی نے احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں اپنے ذاتی تحقیق وتجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ شبلی کے قلم سے لفظ بہ لفظ درج ہے۔ [شبلی سے اس حوالے میں سہو ہوا اسے انہوں نے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ اس عبارت کے لیے دیا ہے اصلاً یہ عبارت احیاء کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں موجود ہے]

''اکثر یہ لوگ سمجھتے ھیں کہ اس [علم کلام] سے حقائق کھل جاتے ھیں اور ان کا پورا پورا علم ھوجاتا ھے لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشفِ حقیقت کے بجائے خبط اور گمراھی زیادہ بڑھتی ھے اور یہ بات اگر کوئی محدثِ [محض] یا ظاھر پرست کھتا تو تم کو خیال ھوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ھوجاتا ھے لیکن یہ بات وہ شخص [یعنی خود امام صاحب] کھتا ھے جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ متکلمین اس سے آگے نہیں بڑہ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ھی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے. واقفیت پیدا کی، یہ سب کر کے وہ علم کلام سے بیزار ھو گیا۔
[الغزالی ص ۱۴۳]

امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے:

میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور وخوض کرلیا تو میں نے دیکھ لیا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب، اور میں نے پایا کہ منزلِ مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا راستہ ہے، اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہوگیا، اس کو یہی معلوم ہوگا۔ [شرح حدیث النزول ابن تیمیہ، ص ۱۰۵، امرتسر]

حافظ ابن قیمؒ نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کیے ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا ہے:

نھـــایة اقـــدام الـعـقـــول عـقـــال   وغـــایة سـعـــی الـعـالـمیـن ضـلال

عقلوں کے قدم کی انتہا ناکشودہ گرہ ہے اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد ناکامی ہے

ولـم نستـفـد مـن بـحثـنـا طـول عـمـرنـا   سـوی ان جـمـعـنـا فیـه قیـل وقـال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کرلیا۔

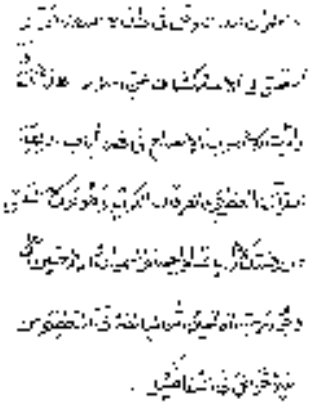

اور جان لو کہ ان تنگ راہوں میں گھسنے اور ان حقائق کے اسرار دریافت کرنے کے لیے غور وفکر کے بعد مجھے اس باب میں صحیح ومناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا اور وہ عقلی کرید کو چھوڑ دینا اور آسمان وزمین کے عجائبات سے اللہ کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر۔

[اجتماع الجیوش الاسلامیہ، ص ۱۲۰، امرتسر]

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ ممتد رہا۔ ۲ رمحرم ۶۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہ نقل کیا ہے اس میں موصوف نے اپنی عمر بھر کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہے۔

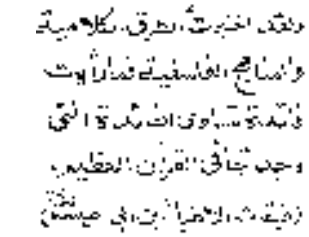

میں نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقوں کو آزمالیا تو میں نے ان کا فائدہ اس فائدہ کے برابر نہیں پایا جس کو میں نے قرآن عظیم میں پایا۔[طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ ص ۲۷]

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا امیدوار ہو کر مر رہا ہوں''۔ اس وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انھوں نے وفات پائی۔ برعظیم پاک وہند کے بڑے متکلم شبلیؒ کو بھی یہ حالت پیش آئی انھیں آخر عمر میں کہنا پڑا کہ:

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود　　گشت رازِ دگرآں راز کہ افشامی کرد

۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ پر حاضری کے لیے بے تاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد و غزالی ورازی وبوعلی سینا کا گزر ہے نہ تاریخ وفلسفہ کا نام ہے۔ شب وروز ہیں اور کتبِ احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیماتِ نبوی کی ترتیب، اخلاقِ نبویؐ کی تحریر، سوانحِ نبویؐ کی تلاش اور سیرتِ نبویؐ کی نادر کتابوں کی جستجو۔ یہی کیفیت علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، رینے گینوں، عبدالماجد دریا آبادی، عبدالباری ندوی، ڈاکٹر ظفرالحسن صدر شعبہ فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی، کو پیش آئی۔ ڈاکٹر ذاکر نائک، وحید الدین خان، جاوید غامدی، اسرار عالم، احمد دیدات کے علم کلام سے آج تک کوئی مسلمان نہیں ہوا اور اپنے دلائل سے یہ لوگ خود مطمئن نہیں لہٰذا ان کا موقف بدلتا رہتا ہے۔ ان حضرات کی تقاریر اور کتابوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔